

غلام حسین ساجد

## .....تو اہل درد کو پنجابیوں نے لوٹ لیا!

سعید ہسٹا کی مرتب کردہ ”کمال کہانی“ کی مختلف کہانیاں ۱۹۹۳ء سے پنجابی زبان کے مختلف ادبی پرچوں میں چھپنی شروع ہوئیں تو دیتا بھر کے پنجابی پیاروں کو جیسے کسی نے ہلا کر رکھ دیا۔ بذات خود میں بھی ان کہانیوں کے پیکٹوں پر ستاروں میں سے ایک رہا ہوں۔ ان پر ستاروں میں سے ایک، جو ان کہانیوں کو بے چشم نم پڑھ بھی نہیں سکتے۔ میرے اس قدر جذباتی پن کی بظاہر کوئی وجہ نہیں مگر ذرا سا غور کرنے پر اس بے اختیار اُٹھانے والے گریہ کی یہ تک پہنچنا ناممکن نہیں رہتا۔

دنیا بھر کے عظیم ادب اور خصوصاً لوک ادب کی سب سے بڑی صفت کیا ہے؟ اُس میں ہمیشہ زندہ رہنے اور اپنے قاری کو زندہ تر رکھنے کی خصوصیت کیوں ہے؟ کیا چیز ہے جو اُسے ابدیت کے درجے پر فائز کر دیتی ہے؟ وقت، کردار، زبان، فضا یا بیان کرنے والے کی انسانی طلاقت؟ کوئی ایک چیز؟ کسی ایک عنصر کی سادہ کاری یا ان سب کے ہم آئیمز ہونے سے پیدا ہونے والا شکوہ! جو غم و خوشی کی ایک سی اُٹھان کو جنم دینے پر قادر ہو۔ اتنا کچھ یا اس کے سوا اور بھی بہت کچھ۔ وہ بہت کچھ، جس کا محسوس کرنا ممکن ہے مگر بیان کرنا ناممکن ہے۔ شاید یہی وہ جو ہر خیالات ہے جو لفظوں اور لفظوں میں چھپی ہوئی دنیا کو اُمر کر دینے پر قادر ہوتا ہے اور اس وسیلے سے ہم چند لوگوں اور چند چیزوں کو نہیں، گزرے ہوئے زمانوں اور ان زمانوں میں سانس لینے والی دنیا کو اپنے سامنے چلتے پھرتے دیکھ سکتے ہیں۔ اس آسودگی کے ساتھ کہ اُس عہد کے درخت، چرند پرند اور نباتات و جمادات ہمیں اپنے سامنے موجود اور زندہ دکھائی دیتے ہیں۔

”کمال کہانی“ کو اسم با سنی کتاب قرار دیا جاسکتا ہے۔ میاں کمال دین کی روایت کردہ

یہ کہانیاں صرف کہانیاں نہیں۔ جہلم اور راوی کے مابین آباد اٹھارویں اور انیسویں صدی کے خطہ پنجاب کے طرز معاشرت کی امین بھی ہیں۔ بظاہر ان کہانیوں کی سب سے بڑی طاقت ان کی زبان ہے جو نازک سے نازک احساس، جذبے اور کیفیت کو نہایت آسانی سے بیان کر دینے پر قادر ہے۔ اس کے باوجود کہ آج پنجابی ادب کے سچے قاریوں کی اکثریت بھی اس کتاب کی زبان، لفظیات کی ندرت، نیرداری اور معانی کی وسعت کا صحیح ادراک نہیں رکھتی کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہم اپنی زبان، اپنی تاریخ اور اپنی مٹی سے گچھڑتے جا رہے ہیں؛ اس کتاب کی زبان میں کچھ ایسا سرا ہے جو ہم کی باطنی سطح کو چھو لیتا ہے اور ان کہانیوں کی فضا، کردار اور ان سے جڑی ہوئی دانش خود بخود ہمارے لبوں کا حصہ بنتی چلی جاتی ہے۔ تا محسوس انداز میں، آکسیجن کی طرح، جو سانس لیتے ہی ہماری رگوں میں بہتے خون کے رنگ کو بدل دیتی ہے۔

میں اکثر سوچتا ہوں کہ اچھے شعر یا اچھی نثر کی بنیادی صفت کیا ہوتی ہے؟ اور بالآخر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اس صفت کی الگ سے پہچان کرنا اور کوئی نام دینا ممکن نہیں۔ پھلوں میں رہے ہوئے ذائقے اور بھولے ہوئے ناموں کی طرف یہ ہمیشہ لوک زبان پر تو رہتی ہے مگر تحت الشعور سے ابھر کر کوئی جانا پہچانا لفظ بننے سے منکر ہے۔ یوں یہ صفت لفظوں کے تال میل، خیال کی ندرت اور صرف و نحو کی درستی اور پابندی سے ماورا کچھ اور بنی شے ہے۔ چیزے دیگر اجماع و فضل، مہارت، محنت اور تسلسل کے ساتھ لکھتے رہنے سے پیدا نہیں ہوتی مگر اسے ہاتھ آتی ہے اور بہت تھوڑے عرصے تک ساتھ نبھاتی ہے۔ کیونکہ میں نے آج تک اپنے عہد کے کسی لکھنے والے کو اس قابل نہیں پایا کہ اسے ہر وقت اور ہمیشہ پڑھا جاسکے اور میں یہ دعویٰ پنجابی زبان تک محدود رہ کر نہیں کر رہا ہوں۔ مگر میں اکثر لوک داستانوں کو لکھ بھر کو بیزار ہوئے بغیر بار بار پڑھ سکتا ہوں۔ حالانکہ وہ لکھی نہیں، سنائی گئی ہوتی ہیں اور ان کو سنانے والوں کے نام ذہن پر زور دے کر بھی یاد نہیں آتے۔

”کمال کہانی“ سے کوئی تیس برس پہلے میں نے محمد سلیم الرحمن اور فاروق حسن کے توسط سے پال بولز کی ترجمہ کی ہوئیں، مراکش کے قصہ گو محمد مرابط کی سنائی ہوئی چند کہانیاں دیکھی تھیں تو انگریزی ترجمے کی اپنی قباحاتوں کے باوجود، ان کہانیوں نے مجھ میں ایک تخلیقی امنگ پیدا کی تھی۔ شاید اس لیے کہ بقول ہنری ملر ”مراٹھ نے ابلاغ کو تمام سطحوں پر ممکن بنانے کا راز معلوم کر لیا ہے۔“ اس طرح کے راز سے شناسا ہونے کی واقعی کوئی صورت اگر ہے تو یقیناً یہ راز میاں کمال دین کو محمد مرابط کے مقابلے میں کہیں بہتر انداز میں معلوم تھا۔ کیونکہ کمال دین کی



سنائی ہوئی کہانیاں وقت کی گرد میں دبی ہوئی دنیا کو زندہ کر دینے پر قادر ہیں۔ اپنے انسانوں، جانوروں، پرندوں، جنگلوں اور دریاؤں سمیت مع ان میں موجود موانست اور یگانگت کے۔ جو آج بھی دلوں کو اسیر کرتی، اور دماغوں کو صقل کر کے ایک اور ہی دنیا کا رزق بناتی ہے۔

”کمال کہانی“ میں گل چودہ کہانیاں (راجا پورس، راجا کرٹال، ملتان و پیرازہ، گاممن، جیار، جاکھتیار کھل، مختصر علی خاں، دانہٹی، نارنگ سائی، نور کند و اسپر، میرٹل واکھل، راء صاحب، نھٹی، چودھری بہاب لہیر، فتح خاں موتیاں آلا، جتنی سوداگر اور چارسیانے) ہیں۔ مجموعی طور پر ان کہانیوں کا زمانہ لگ بھگ ڈھائی ہزار برس پر محیط ہے مگر زیادہ تر کہانیوں کا تعلق اٹھارویں اور انیسویں صدی عیسوی سے ہے۔ ان کہانیوں کا علاقہ ”باروں“ میں پھیلا ہوا پنجاب ہے جہاں کا طرز حیات قبائلی اور جس کا انحصار فطرت کی عطا پر ہے۔ اس خطے کے بسنے والے عزت اور ان کے لیے جیتے اور مرتے ہیں اور دوستی اور دشمنی ہر دو پر کھرے اترتے ہیں۔ دھوکا، فریب، جھوٹ اور عیاری انہیں چھو کر بھی نہیں گزری اور وہ ایک ایسی دانش سے بہرہ مند ہیں جو صدیوں کے سفر، تجربے اور تلاش کے بعد ہاتھ آتی ہے۔ ان کہانیوں کی بنیادی رمز ”حمیت“ ہے جو انہیں کوئی بھی ایسا قدم اٹھانے سے روکتی ہے جو ان کے جوہر حیات کو غارت کر دے اور ان اور ان کے بعد آنے والی نسلوں کے لیے شرمندگی اور دکھ کا باعث بن جائے۔ اس طرز حیات کے اپنانے والوں کے لیے متاع حیات ایک اضافی شے ہے، جس سے الگ ہونے میں وہ ایک لمحہ بھی صرف نہیں کرتے اور اپنی روایات کے نباہ اور حفاظت کی جنگ میں اُسے پرواہ کی حیثیت بھی نہیں دیتے۔ اس جنگ دو میں بہت سے دشمن دوست بن جاتے ہیں اور بہت سے دوست دشمن مگر ان کہانیوں کے کردار خلقی اوصاف اور اخلاقی قدروں سے پھر بھی الگ نہیں ہوتے۔ اس طرح یہ اوصاف، شخصی اوصاف کی سطح سے اوپر اٹھ کر اس سارے علاقے کی عمومی قدر کا درجہ پالتے ہیں اور پورا پنجاب ایک جادوئی وجود بن کر ہم سب سے کلام کرتے لگتا ہے۔

”کمال کہانی“ کو پڑھ کر پتا چلتا ہے کہ چھٹی صدی میں ہم نے کیا کچھ کھو دیا ہے۔ کمال دین ان ہزاروں دانش مند قصہ گوؤں میں سے فقط ایک نام ہے جو سعید بھٹا کی توجہ اور کوشش سے ہم تک پہنچا ہے۔ اُس سے پہلے اور اُس کے ساتھ کے ان گنت قصہ گو اب رزق خاک ہو چکے ہیں اور ان کو زندہ کرنے کی کوئی ترکیب ہمیں معلوم نہیں۔ سچ پوچھیے تو ”کمال دین“ کسی شخص کا نام نہیں۔ ایک روایت کا استعارہ ہے۔ ان کہانیوں کو پڑھ کر مجھے بہت سے ایسے لوگ یاد آئے جو کمال دین کی سی یادداشت اور لسانی طلاقت سے مملو تھے اور کبھی میرے

قریب رہے تھے مگر افسوس کہ میں ان کی اہمیت اور عظمت کو بروقت جان نہیں پایا۔ میں نے انہیں اپنے سامنے بوڑھے ہوتے، زندگی سے جھو جھٹے اور مرتے دیکھا اور انہیں مٹی دیتے ہوئے مجھے خیال بھی نہیں آیا کہ میں کس طرح کی دولت سے محروم ہو رہا ہوں۔ آج ان کہانیوں کو پڑھ کر مجھے ہاتھ آئی ہوئی دولت کی خوشی کم ہے اور کھوئی ہوئی دولت کا رنج زیادہ مگر اب سمجھتا ہوں کیا ہووت: جب چیزیاں چل گئیں کھیت۔

سعید بھٹا نے ”کمال کہانی“ کے پیش لفظ میں میاں کمال دین کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے کہ اُس علاقے کے دانش مندوں کے دلوں میں میاں کمال دین کے لیے ایک خاص طرح کی محبت کا فرما ہے۔ میں کہتا ہوں کہ انہیں میاں کمال دین سے اگر محبت ہے تو اس کی وجہ اُس کی اپنی ذات نہیں، وہ لوگ کہانیاں اور لوگ دانش ہے کہ جن کا وہ ایک طویل عرصے تک امین رہا ہے۔ اب اُس دانش کا ایک حصہ اس کتاب کی زینت ہے تو اس کتاب پر بھی وہی جذبہ اور کشش غالب ہے اور اسی بناء پر یہ کتاب ایک زندہ آدمی کی طرح سانس لیتی اور کلام کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

ابھی تک میں نے ان کہانیوں کے مجموعی تاثر پر بات کی ہے۔ ان کے اندر کی دنیا کی طرف پلٹا ہوں نہ ہی میں نے ان کہانیوں کے کرداروں، اُن کی باہمی کشش، زمانے اور واقعات کی صداقت یا عدم صداقت پر کچھ کہا ہے تو غالباً اس لیے کہ میں اس طرح کے تجزیے کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ یہ کہانیاں جس معاشرت، زمانے اور تاریخ سے جڑی ہیں اُس کی صداقت میں کسی کو شک ہو ہی نہیں سکتا کہ ایک طرف اس صداقت کی تصدیق اُس عہد کی لوگ شاعری سے ہوتی ہے تو دوسری طرف اس عزالت اور خرابی کے زمانے میں بھی ہم اس طرح کے کرداروں اور طرز زندگی کی کبھی کبھار کوئی جھلک، غیر متوقع طور پر ہی کسی مگر دیکھ لیتے ہیں۔ اس طرح کی دنیا کی پرچھائیں اگر اب بھی کہیں کہیں موجود ہے تو ہم ماضی کی اس اساطیر کی سطح کو چھوتی دنیا پر شک کس لیے کریں گے؟ پھر جہاں تک میری اپنی ذات کا تعلق ہے تو مجھے تو ایک لمحے کے لیے بھی اس دنیا کی موجودگی پر شک گزر ہی نہیں سکتا کہ اس کھوئی ہوئی میراث کا کوئی ایک حصہ، ایک معمولی سا ٹکڑا، میرے لہو میں ابھی تک اپنی موجودگی کا پتا دیتا ہے۔ اسی لیے ان کہانیوں کو پڑھ کر مجھے پھر وہ طاقت ملی ہے کہ تمدنی معاشرت کا صید ہو کر میں آج جس سے کم و بیش محروم ہو چکا تھا۔

میاں کمال دین کی سنائی ہوئی کہانیاں نری کہانیاں نہیں کیونکہ انہیں پڑھ کر بھلا دینا ممکن نہیں۔ یہ وہ صفت ہے جو دنیا بھر کے بڑے ادب میں موجود ہوتی ہے مگر کم کم۔ کیونکہ زبان، معاشرت، پہچان میں آنے والے کردار اور یادوں میں زندہ رہ جانے والا وقت کم ہی اس



سیلتے سے بہم آمینت ہو پاتا ہے، جس سلیقے اور آسائش کا احساس ہمیں ”کمال کہانی“ کی کہانیوں کو پڑھ کر ہوتا ہے۔ یہ سبھی کچھ اگر معجزہ نہیں تو کرامت ضرور ہے اور ایسی کرامتوں کا ظہور کبھی آسانی اور تو اتر سے نہیں ہوا کرتا۔ خصوصاً پنجابی ادب میں اس کے بار و گر ظہور کرنے کی شاید اب کوئی صورت نہ بنے۔

بزرگوں سے سنا ہے کہ اچھی بات کہنے والے کی ذات نہیں دیکھنی چاہیے۔ صرف یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اُس نے کہا کیا تھا! بہت برس پہلے اُردو کے ایک ادیب سید قاسم محمود نے کسی کتاب کے پیش لفظ میں لکھا تھا کہ ہمیں اُن لکھنے والوں کا خط لکھ کر شکریہ ادا کرنا چاہیے جو ہمیں حقیقی مسرت کے کچھ لمحے فراہم کرتے ہوں۔ آج میں سعید بھقا کا اور اُس کے توسط سے میاں کمال دین کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جن کی اس کاوش نے مجھے صرف مسرت ہی نہیں بخشی، آنسو بھی دیے ہیں۔ کہتے ہیں، تم ساتھ مل کر سہنے والوں کو بھول سکتے ہو مگر ساتھ مل کر رونے والوں کو نہیں۔ میرے لیے بھی اب ان دونوں صاحبان کو بھولنا ممکن نہیں رہا۔

ایک زمانہ ہوا، انشا اللہ خان انشاء نے کہا تھا:

سنایا رات کو قصہ جو ہیر رانجھے کا  
تو اہل درد کو ہتھالیوں نے لوٹ لیا

آج ”کمال کہانی“ کے روپ میں اہل درد کے لئے کا سامان ایک بار پھر موجود ہے۔ پنجاب اور پنجاب سے باہر کے عشاق اگر چاہیں تو بے خطر اس علاقے میں چلے آئیں کہ سعید بھقا نے اس کتاب میں اُن کے لیے لذتِ نیشِ جگر کا دافراہتمام کر رکھا ہے۔

(۱۶، ۱۷ نومبر ۲۰۰۷ء، لاہور)